جگن ناتھ آزاد اور ان کا نظریۂ وابستگی

کلیدی الفاظ: #نظریۂ وابستگی #ترقی پسند تحریک # تخلیقی عمل # جگن ناتھ آزاد #انسانی رشتہ #
وطن دوستی #فطرت # تقسیمِ ملک

ڈاکٹر احمد امتیاز

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص: اردو میں نظریۂ وابستگی کی مبحث کا آغاز ترقی پسند عہد کے بعد ہوا۔ اس بحث میں یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ آیا ادیب، ادب کے کسی نظریے کا حامی ہے یا اس کا منکر۔ اس مباحث کی جڑیں ہمیں ادب برائے ادب، ادب برائے فن یا ادب برائے زندگی کی پرانی مبحث میں مل جاتی ہیں۔ اس بحث میں فرد اور سماج کے باہمی رشتوں کا قدیم مسئلہ بھی مضمر ہے۔ ہمارے یہاں بھی چند ایسے ادیب اور فنکار سامنے آئے تھے جنھوں نے اپنے آپ کو نئے معاشرے کا تنہا آدمی کہنے یا کہلانے پر زور دیا تھا۔ اصل معاملہ ادب میں فکر و فن کے باہمی متعلقات کا ہے اور جو لوگ ادب میں کسی قسم کی وابستگی سے انکار کرتے ہیں وہ درحقیقت فکر کی اہمیت کے ہی منکر ہیں اور وہ بہت حد تک فن پرستی کے شدید مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ کوئی بھی فرد نہ تو اپنے سماج سے یکسر جدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ادیب فکر سے منھ موڑ کر بامعنی فنی کوشش کو سرانجام دے سکتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے زندگی سے گہری وابستگی میں جن چیزوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا وہ انسانی رشتہ، وطن دوستی اور فطرت سے لگاؤ تھا۔ انسانی رشتوں کی اس وابستگی میں افرادِ خانہ سے لیکر علمی و ادبی شخصیات بھی شامل تھیں۔ جن سے گہری وابستگی کا اظہار اُن کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔

....

اردو ادب میں باضابطہ طور پر ترقی پسند دور کے بعد وابستگی (Commitment) کے نظریے پر بحث شروع ہوئی اور اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی کہ آیا ادیب کی وابستگی اُس کے اپنے عہد سے یا اُس عہد کے کسی

خاص نظریۂ حیات سے یا کسی نقطۂ نظر کے ساتھ ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ یعنی یہ پتہ لگانا مقصود تھا کہ ادیب، ادب کے کسی نظریے کا حامی ہے یا اس کا منکر۔ غور کریں تو اس مباحث کی جڑیں ہمیں ادب برائے ادب، ادب برائے فن یا ادب برائے زندگی کی پرانی مبحث میں ہی مل جائیں گی۔ تاہم نئے حالات کے تحت نئے تقاضوں کا اضافہ اس میں ضرور کارفرما ہے۔ اس بحث میں فرد اور سماج کے باہمی رشتوں کا قدیم مسئلہ بھی مضمر ہے۔ جدید علوم کے عام ہونے کے بعد ہمارے یہاں بھی چند ایسے ادیب اور فنکار سامنے آئے جنھوں نے اپنے آپ کو نئے معاشرے کا تنہا آدمی کہنے یا کہلانے پر زور دیا۔ غور کریں تو اصل معاملہ ادب میں فکر و فن کے باہمی متعلقات کا ہی ہے اور جو لوگ ادب میں کسی قسم کی وابستگی سے انکار کرتے ہیں وہ در اصل فکر کی اہمیت کے ہی منکر ہیں اور وہ بہت حد تک فن پرستی کے شدید مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ کوئی بھی فرد نہ تو اپنے سماج سے یکسر جدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ادیب فکر سے منھ موڑ کر بامعنی فنی کوشش کو سرانجام دے سکتا ہے۔ عدم وابستگی کا پرچم بلند کرنے والے شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اجتماعی اور معاشرتی عمل میں شریک ہونا تخلیقی بقا کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن یہ طرزِ فکر بھی فریبِ نظر سے کچھ کم نہیں، کیوں کہ ادب میں تمام مباحث فکر و خیال ہی کی ہوتی ہیں۔ اس لیے میرا یہ ماننا ہے کہ ادیب کے پاس ذہن ہے تو اُس میں کوئی نہ کوئی خیال بھی ہوگا اور اگر خیال ہے تو اس سے اس کی شعوری یا غیر شعوری وابستگی بھی ہوگی۔ ادیب کوئی بھی ہو اُس کی وابستگی نہ صرف خیال سے بلکہ اُس کی اپنی ذات اور ضمیر سے بھی ہوتی ہے جس کی بنیاد وفاداری پر ہے اور وفاداری کا دعویٰ بشرطِ استواری ممکن ہی نہیں۔ اس لیے ادیب کی ذمہ داری، ادب کے تئیں، ایک عام قاری کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے۔ اقبال نے کہا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اس شعر میں وابستگی (Commitment) کی ہی بات تو کی گئی ہے۔کسی ادیب یا فنکار کے لیے کسی قسم کی فکر اور ذہنی وابستگی دراصل زندگی کا سراغ ہی تو ہے۔خود شناسی کے اسی عمل سے ادیب کے تخلیقی رویے کا پتہ بھی چلتا ہے اور اُس کی متانت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔اِس لیے کوئی بھی ادیب اپنے تخلیقی نگارشات میں کیسا ہی وسیلۂ اظہار اختیار کرے، کیسا ہی اسلوبِ بیان منتخب کرے، وہ فکر وخیال سے ناوابستہ نہیں ہوسکتا۔اِس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ادب میں بے غرضی و بے نیازی اور ناوابستگی کا دعویٰ کسی بھی ادیب کے تخلیقی عمل میں، خواہ وہ خصوصی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کا عمل ہی کیوں نہ ہو، فن کو جلا نہیں بخش سکتے۔حامدی کاشمیری کا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''فنکار لسانی توسط سے اپنے دائرۂ کار میں بنیادی طور پر نمودِ صورت کا اہتمام کرتا ہے۔اِس سے اُس کی ازلی تخلیقی اُپج کی تشفی اور تکمیل ہوتی ہے جو اُسے فطرت سے ودیعت ہوتی ہے اور جو اُسے نابود کو بود کرنے کی تحریک دیتی ہے۔.....اُس کا عمل محض ذاتی یا موضوعی ہو کر نہیں رہ جاتا کیوں کہ وہ فطرت یا کائنات کے دائرۂ کار میں آجاتا ہے۔اِس لیے اُس کا عمل اجتماعی منظوری کا حقدار ہوجاتا ہے۔.....اپنی تخلیقی Urge کی تکمیل کرتے ہوئے وہ اپنے حواس کو بیدار رکھتا ہے خاص کر وہ اپنی چشمِ بصیرت کو وا رکھتا ہے اور زندگی کے

ثقافتی مظاہر،سماجی روابط،انسان اور فطرت کے باہم ربط وکشاکش اورحیات وممات کی آ گہی پر قادر ہو جاتا ہے۔.... یہ آ گہی اُس کے تخلیقی عمل کو مہمیز کرتی اورتخلیقی عمل آ گہی کو نام ونمود عطا کرتا ہے ۔نتیجتاً اُس کا تخلیقی عمل ذاتی ہو کر بھی غیر ذاتی ہو جاتا ہے اور وہ پوری انسانیت کے مقدر سے متعارض ہو جاتا ہے اور تخلیق سے قارئین کے ربط و وابستگی کا جواز فراہم کرتا ہے۔''(تنقید کی جمالیات، جلد ۸ :عتیق اللہ ۔کتابی دنیا،دہلی ۔ص۸۱۔۲۸۰)

میں نے مذکورہ انہیں خیالات کی روشنی میں جگن ناتھ آزاد(۱۵/ دسمبر ۱۹۱۸ءتا۲۴/جولائی۲۰۰۴ء) کے تخلیقی رویے کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔جگن ناتھ آزاد ہمارے گزشتہ دور کے ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اپنے تخلیقی نگارشات میں ادب اورزندگی سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا تھا اورناوابستگی کے نظریے کو بھر پور طریقے سے ردّ کیا ۔جگن ناتھ آزاد کے مختلف شعری مجموعوں مثلاً: بیکراں، ستاروں سے ذرّوں تک، وطن میں اجنبی ،نوائے پریشاں، بوئے رمیدہ اور کہکشاں کوزندگی سے بھرپور روابط کے سبب ہی مقبولیت اورشہرت ملی۔انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کو کسی ایک صنف تک محدودنہیں رکھا بلکہ غزل،نظم، مرثیہ،مثنوی، رباعی جیسی اصنافِ سخن کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ وہ اردو زبان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''میری مادری زبان پنجابی ہے لیکن اوڑھنا بچھونا اردو ہے''۔اردو کی ترقی کو ہندوستان کی ترقی تصور کرنے والے جگن ناتھ آزاد کا یہ شعر

اِس بات کا بین ثبوت ہے:

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی
یہ ہے اخلاص کی،طرزِ تکلم،پیار کی بولی

یہاں پر یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جگن ناتھ آزاد کا ایک بہت بڑا زمانہ ترقی پسند تحریک کے دور سے تعلق رکھتا ہے اِس لیے یہ گمان بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کے یہاں وہ تمام تصورات ملتے ہیں جن کا تعلق ترقی پسند حقیقت نگاری سے تھا۔وہ حقیقت نگار ضرور تھے لیکن اُنہوں نے اپنے آپ کو کسی خاص تحریک یا کسی خاص رجحان سے وابستہ نہیں کیا تھا۔زندگی سے وابستگی ہی اُن کا بنیادی تصور تھا جسے ہم اُن کے وژن سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔جگن ناتھ آزاد نے زندگی سے گہری وابستگی میں جن چیزوں کو قدر کی نگا سے دیکھا وہ انسانی رشتہ،وطن دوستی اور فطرت سے لگاؤ تھا۔انسانی رشتوں کی اس وابستگی میں افرادِ خانہ سے لیکر علمی وادبی شخصیات بھی شامل تھیں۔جن سے گہری وابستگی کا اظہار اُن کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔اپنی رفیقۂ حیات کی رحلت پر اُنہوں نے جو شخصی مرثیے لکھے ہیں اُن میں اُن کا خلوص،اُن کی ہمدردانہ رفاقت،اُن کی محبت اور اُن کے غمِ پنہاں کا ایسا شدید اظہار ہوا ہے جس کی مثال خال خال ہی نظر آتی ہے۔پہلے ''شکنتلا'' سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اے گرفتارِ تپِ کہنہ قرارِ چشم ودل
ایک مدت تک رہی ہے تو علیل ومضمحل
شکر ہے آخر حوادث کا یہ بادل چھٹ گیا
شکر ہے آخر ترا دورِ مصائب کٹ گیا
سامنے میرے دعاؤں کا مری انجام ہے
اب ترے ہر درد، ہر تکلیف کو آرام ہے
اب نہ روئے گی تو اپنی بچّیوں کو دیکھ کر

اور اُس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر
ہائے کیا نقشہ دیکھایا گردشِ ایام نے

تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے
چن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں
گوہرِ اشکِ رواں دے کر انہیں لایا ہوں میں

اب ''ایک آرزو'' میں پنہاں کیفیت دیکھئے:

تو کہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار
قسمتِ بیدار ہر دردِ نہاں کی چارہ کار
ہوگئی تو آبشاروں کے ترنم میں مکیں
یا ٹھکانہ کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں
دیدۂ آہو میں ہے تو یا رمِ آہو میں ہے
کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے
تتلیوں کے خوش نما رنگوں میں آرامیدہ ہے
وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے
جنّتِ گم گشتہ پوشیدہ تر از کیفِ بہار
جستجو میں تھک گئی ہے میری چشمِ انتظار
اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ درد مند
اے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

دل کی وابستگی کا ایسا ہی گہرا جذباتی اظہار ہمیں پیغمبرِ اسلام محمدؐ، تلوک چند محروم، علامہ اقبال، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور عبدالمجید سالک پر لکھی گئی تخلیقات میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں خلوت پر جلوت کا اثر نہ پڑتا ہو۔ اس لیے ہر تنہائی، خارجی ماحول کی نمائش سے معمور ہوتی ہے اور ہر ادیب ایک شخص ہوتا ہے

جو گرد و پیش سے اثرات قبول کرتا ہے نیز گرد و پیش پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ گرد و پیش کے ساتھ ادیب کا یہ ارتباط اُس کی دل بستگی اور وابستگی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر انسان پیدا ہوا ہے تو داخلی و خارجی حالات سے اُس کی وابستگی ہو گی ہی۔ وطن سے وابستگی بھی اُسی سے منسلک ہے۔ خواہ زندگی اسے مسافر کی طرح دور دراز کے علاقوں میں ہی کیوں نہ پہنچا دے۔ انسان اپنے وطنِ مالوف سے دلی و ذہنی اعتبار سے جدا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اپنے وطن سے وابستگی کا اظہار جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں بھی ہوا ہے۔ ''وطن میں اجنبی'' میں شامل نظم 'سیرِ پاکستان' کا یہ بند اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

اے وطن ،اے فخرِ اقطاعِ جہاں
خاک تیری سجدہ گاہِ قدسیاں
حق پرستوں کے، فقیروں کے وطن
دہر کے روشن ضمیروں کے وطن
فکرِ وارث شاہ کا مسکن ہے تُو
قلبِ حق آگاہ کا مسکن ہے تُو
تُو ہے نانک کی نظر سے فیضیاب
قطبِ دوراں کے اثر سے فیضیاب

اور وطن سے جدائی کا غم انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

اس غم میں مری روح پریشاں ہے ابھی تک
اک درد سا احساس میں غلطاں ہے ابھی تک

نظم ''واہگہ کی سرحد پر'' میں بھی اسی جذبے کو پیش کیا گیا ہے:

ہیں آج رقص میں عہدِ طرب کے میخانے
چھلک رہے ہیں نگاہوں سے دل کے پیمانے
جہانِ شوق کا ہر ذرہ پیچ و تاب میں ہے

یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سنا گئے مری پلکوں پہ آ کے اشکِ رواں
ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے
خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

جگن ناتھ آزاد کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے حادثات میں وطن بدری بھی ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس غم اور تنہائی میں وہ جن کیفیات سے گزرے اسے بھی انہوں نے منظوم کیا۔ جسمانی اور روحانی المیے کی یہ داستان انہوں نے بار بار دہرائی ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد جب وہ اپنے وطن کو خیر باد کہتے ہیں تو اس کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے
یا جیسے چلے دُرِ عدن کانِ عدن سے
آہوئے خُتن یا ہو رواں دشتِ خُتن سے
آزاد! ہم اِس طرح چلے اپنے وطن سے
جس گھر کی فضاؤں میں جئے اور پلے ہم
اُس گھر کو لگی آگ تو اُس گھر سے چلے ہم

تقسیم کے وقت دونوں ملکوں کی جو صورتِ حال تھی اُس کی تفصیل بھی ملاحظہ کریں:

اِک حشر کا سامان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
اِک آگ کا طوفان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
انسان پریشان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
ہر روح میں پیکان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
ہر سمت سرِ ارضِ قضا ناچ رہی تھی
دریاؤں کی موجوں میں بَلا ناچ رہی تھی

ادیب روایت سے منحرف ہو کر کسی قسم کی انفرادی صلاحیتوں کا بامعنی، مفیداور مؤثر اظہار نہیں کرسکتا۔فن کی روایت سے وابستگی فنکار کی اوّلین شرط ہے۔ادیب کی اپنی شناخت کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تہذیبی روایت کا اعتراف کرے کیوں کہ تہذیبی روایت کے زیرِ اثر ہی کسی ادیب کو اس کا تشخص عطا ہوتا ہے۔اِس کے بغیر وہ محض معاشرے کے ارتقاء کی ٹوٹی ہوئی کڑی ہے۔اپنے ماحول ومعاشرے سے کٹ کر ادیب اپنے فن کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔اِس لیے ماحول ومعاشرے سے ادیب کا منسلک ہونا ایک فطری عمل ہے۔ادیب کے جذباتی اور فکری میلان پر جب تک خارجی عناصر اثر انداز نہیں ہوتے وہ اپنی ذات وضمیر کو تخلیقی شکل عطا نہیں کرسکتا۔جگن ناتھ آزاد نے تقسیمِ ملک کے خارجی اثرات قبول کیے،ہجرت کی صعوبتیں جھیلیں،اجنبی دیار میں اپنے تشخص کے لیے جِد وجُہد کی،تہذیبی روایت سے رشتہ استوار کیا،نئے ماحول میں جینے کا حوصلہ پیدا کیا،اپنوں اور دوسروں کے غموں کو یکساں جانا،آغوشِ مصائب ومسائل سے فرار اختیار کرنے کے بجائے اُس سے لڑنے اور اسے شکست دینے کی کوشش کی۔اِس طرح یہ آزاد کے تخلیقی رویے کا امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنے فنی اور تخلیقی اظہار کو ایک نئی معنویت دی اور ظاہر وباطن کی کشمکش کو کم کر کے اپنے شعری وجدان کو پائیداری عطا کی۔

اپنے والد تلوک چند محروم کی نسبت سے جگن ناتھ آزاد کا ادبی نصب العین بھی وہی تھا جو علامہ اقبال کا تھا یعنی زندگی کی روحانی شادابی اور اخلاقی آراستگی۔تاہم منظّم فکر وفلسفہ کے سبب اقبال کے فن میں والہانہ اور عاشقانہ عنصر گہرا تھا جب کہ جگن ناتھ آزاد کوئی معین ضابطۂ فکر نہیں رکھتے تھے۔اس کے باوجود وہ فن کی ضابطہ بندی کے قائل تھے۔شعری طریقِ کار یا اسلوبِ سخن کے اس فرق کو دیکھنے کے لیے کسی ایک ہی موضوع سے متعلق دونوں کی متعدد نظموں کا مطالعہ اور موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

میرا ایسا خیال ہے کہ جگن ناتھ آزاد کے یہاں جو فطرت سے محبت کا جذبہ

کارفرما ہے وہ بھی اپنے وسیع معنی میں اقبال سے دلی وابستگی کا ہی مظہر ہے۔ اقبال کو انہوں نے جو القابات عطا کیے ہیں مثلاً: شاعرِ روشن ضمیر، کاروانِ فکرِ تاباں کے امیر، محرمِ رازِ حیات، واقفِ سرِّ مقاماتِ حیات، سینۂ مشرق کا قلبِ سلیم یا ماتمِ اقبال کے نام سے لکھا گیا شخصی مرثیہ یا اُن پر جو دیگر تحریریں ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انہیں اقبال سے کتنی دلی قربت رہی ہوگی۔ اقبال کے تعلق سے اُن کے یہ اشعار بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں:

تری نگاہ گئی بزمِ کہکشاں سے پرے
وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند
مہ و ستارہ و برقِ طپاں و مہرِ مبیں
تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں نہ کمند

یا

سکونِ صبح میں پایا ہے میں نے دل کا حضور
ترے کلام میں پائی ہے میں نے دل کی کشاد

آزاد، اقبال ہی کی طرح فطرت کو ایک تخلیقی قوت اور شاعرانہ عنصر کے طور پر دیکھتے تھے۔ فطرت کے حسین نقوش سے استفادہ کرنے کا عمل اِس لیے دونوں شاعروں کے یہاں یکساں نظر آتا ہے۔ اقبال اور جگن ناتھ آزاد دونوں کی نظموں میں فطرت کو ایک اخلاقی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس میں اجتماعی مسائل کے حل ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اخلاق اور اصلاحی نقطۂ نظر سے آراستہ نظمیں آزاد کے تخلیقی رویے کا بنیادی محور ہیں۔ اس تعلق سے ذرّہ و قطرہ، بھارت کے مسلماں، دہلی کی جامع مسجد، اردو وغیرہ نظموں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسی نظموں میں آزاد انسانی کرداروں اور واقعات کی تصویر کشی اس انداز سے کرتے ہیں کہ شدّت کے ساتھ جذبۂ ترحّم اور احساسِ ہمدردی ابھرتی ہے۔ جن نظموں میں فطرت کو موضوع و محور بنایا گیا ہے اُن میں ایک منظر، ڈل کے کنارے، ایک

صبح، چاندنی اُتری پھلواری میں، کنارِ راوی، مدراس کے ساحل پر، چاندنی رات، لارسن باغ میں ایک لمحہ وغیرہ بہت اہمیت کی حامل نظمیں ہیں۔ شام کی کیفیت پر اقبال نے کہا تھا:

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے
مخمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے وہ موتی پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

اسی شام کی کیفیت کو آزاد یوں نظم کرتے ہیں:

یہ وقتِ شام، یہ آبِ رواں، یہ تنہائی
سکوتِ شام میں قدرت کی محفل آرائی
فضا ہیں تین طرف سے ہجوم ظلمت کا
اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی
بجھی وہ چشمِ زدن میں شفق کی شمعِ حیات
فلک پہ چار طرف گھر کے تیرگی چھائی
وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوۂ مہتاب
زمیں کا حُسن بڑھانے کو چاندنی آئی
(کنارِ راوی)

اقبال کی طرح آزاد بھی مناظرِ فطرت سے روح کو پاکیزہ اور گہرائی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ تخیل کی جولانی سے ہمکنار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ دریاؤں،

کہساروں، ندیوں، نالوں، جھرنوں اور آبشاروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اقبال ہی کی طرح آزاد بھی انسان اور فطرت کو کوئی جداگانہ شئے تصور نہیں کرتے۔ ان دونوں شعراء کے کلام میں اسلامی تہذیب وتمدن اور مذاہب کے تئیں عقیدت واحترام کا جذبہ نمایاں ہے۔ دونوں نے انسان دوستی، عالمی اخوت، جدوجہد، عمل کی تلقین جیسے خیالات کے ساتھ پیار ومحبت اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر توجہ دی ہے۔ آزاد نے محض فکری اور نظریاتی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ فنی اعتبار سے بھی اقبال سے کسبِ فیض کیا ہے اور اسی سے آزاد کی قلبی، فکری اور فنی وابستگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

تقسیمِ ملک کی شاعری میں کشاکشوں کی نوعیت الگ تھی۔ آزادی کے زمانے تک یہ کشاکش اجتماعی ضمیر سے ہم آہنگ تھی۔ آزادی کے بعد جب زندگی کے تقاضے بدلے تو اجتماعی ذہن وضمیر کی بساط بھی پلٹ گئی۔ سماجی بکھراؤ کی اس نئی صورت میں انسانی رشتوں کا تقدس بھی پامال ہوا اور سماجی کردار کی پاسداری بھی مجروح ہوئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُس دور میں فنکاروں نے خصوصیت کے ساتھ سماجی بکھراؤ کو دور کرنے کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ جگن ناتھ آزاد نے بھی اپنی شاعری میں تہذیبی زوال، اخلاقی پستی، قدروں کی شکستہ حالی، نسل کشی، نئی نسل کی بے راہ روی، تشدّد، فرقہ وارانہ فسادات، سماجی نابرابری، ظلم وجبر وغیرہ کو خصوصیت کے ساتھ موضوع بنایا ہے اور مشترکہ تہذیب کے فائدے اور نقصانات کی نشاندہی کی۔ ان کی شاعری میں زندگی کے نشیب وفراز میں یقین وبے یقینی کا شور، شکست و ریخت میں خوشیوں کے امکانات اور زندگی کی نارسائی میں امید کی کرن، اپنے گہرے نقوش ظاہر کرتی ہیں۔ آزاد اپنی شاعری کے ذریعے اپنے سماجی کردار کا تعین بھی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی تمناؤں اور تنہائیوں، محبتوں اور محرومیوں کے درمیان اپنی شناخت بھی قائم کرتے ہیں۔ اس لیے اُن کے تخلیقی رویے میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ سماجی صداقت، تہذیبی وراثت اور اخلاقی نصیحت ہے۔ اُن کے اسی خلوصِ عمل نے اُس عہد کے گم شدہ تشخص کی بازیافت پر

دیگر شعراء کو بھی اکسایا تھا۔

الیکزنڈر ہرجن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ماضی کی جتنی گہری جستجو ہوگی اتنے ہی مستقبل کے معنیٰ واضح ہوں گے۔'' اس خیال کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں ماضی کی جستجو نے ہی مستقبل کے امکانات روشن کئے ہیں۔ وہ جس قدر Nostalgic ہوتے ہیں ان کے کلام میں اسی قدر تخلیقی رمق پیدا ہوتی ہے۔ نئی زمین، نئے ماحول اور نئی فضا کو وہ جس قدر جذب کرتے جاتے ہیں اسی قدر اپنی فکری سچائیوں کا ادراک و اظہار بھی کرتے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں لمحہ لمحہ اذیتوں اور جسارتوں کو رقم کرنے کی جستجو بڑھتی جاتی ہے۔ عرصۂ حیات خواہ ان پر جس قدر بھی تنگ رہی ہو، وہ امید کی کرن کو بجھنے نہیں دیتے۔ تعذیب بھوگنے کے باوجود فرار کا راستہ اختیار نہیں کرتے بلکہ عصری اور معاشرتی اختلال کے وجوہات تک رسائی حاصل کرنے اور زندگی کو مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان معنوں میں دیکھیں تو جگن ناتھ آزاد کا رشتہ انسانی قدروں سے گہرا اور اٹوٹ نظر آتا ہے۔ اسی پس منظر میں ان کے یہاں بین الانسانی شیرازہ بندی کی خواہش بھی جنم لیتی ہے۔ ان کا شعری سفر انہی وابستگی کی بنا پر پیچیدہ اور مشکل بھی رہا لیکن انہوں نے اپنی زندگی کے حالات کو کبھی اپنے فن کے لیے مسئلہ نہیں بننے دیا۔ انہوں نے زندگی بھر موضوع کی صداقت اور زندگی کے حقیقی تناظرات کو ترجیح دی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا لہجہ اور لفظ بندی کا عمل ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے زندگی کو مثبت نظر سے دیکھا اور اُس کا حقیقی سراغ پانے کے لیے ماضی اور حال کی ٹوٹی پھوٹی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی۔ آج ہم ایک طویل سفر طے کر کے اکیسویں صدی میں پہنچ چکے ہیں، حالات پہلے سے بہت کچھ بدل چکے ہیں لیکن جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا جو بنیادی پیغام ہے، اسے پڑھ کر اور سمجھ کر، سوچ کی گزرگاہیں روشن ہو جاتی ہیں۔

****